UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

برصغیر کے اردو دعوتی ادب کا ناقدانہ جائزہ

Critical Review of Urdu Invitational Literature of the Subcontinent

Hafiza Sundas Hanif
PhD. Scholar, Department of Urdu,
Govt. College University, Faisalabad
Email: hafizasundashanif1988@gmail.com

Dr. Yasmin Nazir
Assistant Professor, Department of Islamic Studies,
Government Sadiq College Woman University, Bahawalpur.
Email: yasmin.nazir@gscwu.edu.pk

Abstract:
Invitational literature in Urdu is a continuation of the millennial literature of Muslims in the subcontinent. His social and cultural life, values and traditions, historical and intellectual factors, etc., which made his national life meaningful in this subcontinent, are preserved in his collection of literature. From the very first day of his poetry and literature, emphasis has been placed on Islamic values and values. Urdu poetry and literature were started by Sufi scholars who used Urdu instead of Arabic and Persian as a medium of expression for the sake of preaching Islam. The archives, treatises, poems and hymns of these scholars and Sufis are in fact the first impressions of Da'wah literature in Urdu. The first book of Urdu prose "Miraj-ul-Aashiqeen" which contains the archives of Khwaja Banda Nawaz Geso Daraz is also the first book of Da'wah in Urdu. After the death of Bahadur Shah I in 1712, the central government of Delhi became increasingly weak. The Persian language automatically joined the Mughal Empire in its wake. When the central government of Delhi weakened, the sphere of influence of Persian also narrowed and local languages began to take its place. In this situation, Urdu began to move forward. Religious scholars have made Urdu, a popular language, a medium of instruction and dissemination of religious knowledge, instead of Persian.
***Keywords**: subcontinent, Invitational, literature, Urdu.*

تعارف

اردو میں دعوتی ادب برصغیر میں مسلمانوں کے ہزار سالہ ادبیات کا تسلسل ہے۔ان کی معاشرتی و ثقافتی زندگی،اقدار و روایات تاریخی و فکری عوامل وغیرہ جس سے اس برصغیر میں ان کی قومی زندگی بامعنی بنی،ان کے ذخیرہ ادبیات میں محفوظ ہے۔ان کے شعر و ادب میں روزاول ہی سے اسلامی افکار و اقدار پر زور دیا جاتا رہا ہے جو کہ قرآن کریم کی اس آیت کا مصداق ہے:

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

"ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ"(۱)

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ اردو شعر وادب کا آغاز ان علماء وصوفیائے کرام نے کیا جنھوں نے تبلیغ اسلام کی خاطر عربی اور فارسی زبانوں کے بجائے اردو کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ان علماء وصوفیائے کرام کے ملفوظات، رسائل، اشعار اور مثنویاں درحقیقت اردو میں دعوتی ادب کے اولین نقوش ہیں۔ اردو نثر کی پہلی کتاب ''معراج العاشقین'' جو خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے ملفوظات پر مشتمل ہے اردو میں دعوت دین کی بھی اولین کتاب ہے۔ دعوتی ادب کے فکری پس منظر میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی تحریک تجدید واحیائے اسلام کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ شہنشاہ اکبر کے پھیلائے ہوئے گمراہ کن ''دین الٰہی'' کے اثرات کو زائل کرنے کا کام کسی حد تک مجدد الف ثانی اور ان کے ہم خیال معاصرین نے انجام دیا۔ شیخ مجدد کے زمانے میں ہندومت کی منظم احیائی تحریکوں کے اثرات پھیلنے لگے تھے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ حکومت کا رخ اسلام کی طرف اور اس کا رویہ احکام شرعی کی طرف عقیدت مندانہ ہوگیا۔ بعدازاں اورنگزیب عالم گیر اور داراشکوہ کا تصادم دراصل اکبری اور مجددی رجحانات کا تصادم تھا۔ داراشکوہ آزاد خیال واقع ہوا تھا اور فکری اعتبار سے اکبر بادشاہ کے زیادہ قریب تھا۔ جبکہ اورنگ زیب راسخ العقیدہ مسلمان تھا، اورنگ زیب کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ شیخ مجدد کے خلیفہ خواجہ محمد معصوم کا مرید تھا اور اس نے اسی نقطہ نظر کی پیروی کی۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اسلامی افکار وخیالات، تہذیب وثقافت اور اسلامی علوم و فنون کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ 1707ء میں عالم گیر کا انتقال ہوا تو مرہٹہ بکھر چکی تھی، دکن فتح ہو چکا تھا، اس طرح مغلیہ سلطنت مستحکم ہو چکی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد ہندوستان کا سیاسی نقشہ بہت حد تک بدل گیا تھا۔ جنوب میں مرہٹے اور شمال میں جاٹ اور سکھ مغل سلطنت کے علاقہ جات پر مسلسل قابض ہو رہے تھے۔ مغلوں کی عسکری توانائی بتدریج ختم ہو رہی تھی۔ بہادر شاہ اول کی وفات 1712ء کے بعد دلی مرکز کی حکومت تیزی سے کمزور ہوتی گئی۔ مغلیہ سلطنت کے ہمہ گیر زوال کی رو میں فارسی زبان بھی خود بخود شامل ہوگئی۔ دلی کی مرکزی حکومت کمزور پڑی تو فارسی کے اثرات ورسوخ کا دائرہ بھی سمٹتا چلا گیا اور اس کی جگہ مقامی زبانیں لینے لگیں۔ اس صورت حال میں اردو آگے بڑھنے لگی۔ علمائے دین نے فارسی کے بجائے عوامی زبان اردو کو دینی علوم کی درس وتدریس اور اور نشرواشاعت کا ذریعہ بنایا۔

اردو نظم میں دعوتی ادب کی روایت اور دعوتی ادب کے اولین معمار:

ولی دکنی :

شیخ مجدد کے سلسلہ کے بزرگوں نے اردو کو ہندی اثرات سے پاک کرنے اور اسلامی فکر و نظر کا ترجمان بنانے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ اس دور کے نقشبندی مجددی بزرگوں میں شاہ گل، سعد اللہ شاہ گلشن، شاہ عبدالغنی مجددی، مرزا مظہر جان جاناں، خواجہ محمد ناصر عندلیب اور خواجہ میر درد وغیرہ اہم تھے۔ ولی دکنی، سعد اللہ شاہ گلشن سے بیعت تھے اور ان کے مشورہ پر ولی نے اپنا اردو دیوان، فارسی دیوان کی طرز پر مرتب کیا۔ اس میں بھاشا کی بجائے فارسی کے مروجہ مضامین داخل کیے۔ ان کے متعلق نجم الاسلام لکھتے ہیں:

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

"زبان دکنی میں بھاشا کے طرز پر شاعری کا رواج تھا اور ہندیت کا غلبہ تھا۔ لیکن شاہ گلشن نے شیخ مجدد کے سلسلے کے بزرگ ہونے کی حیثیت سے ہندو مذہب کے عناصر کے خلاف شدت..... میں سے کچھ نہ کچھ حصہ پایا تھا کہ یہ چیز شیخ مجدد، ان کے خلفا اور پورے سلسلے کی خصوصیت تھی۔"(۲)

دیوان ولی کی آمد 1721ء سے قبل کے دور کو ریختہ گوئی کا دور کہا جاتا ہے۔ شمالی ہند کے شرفاء اٹھارہویں صدی سے قبل ریختہ کو ادبی لحاظ سے بہت کم تر درجہ دیتے تھے۔ بقول تبسم کاشمیری:

"وہ اس زبان میں قصباتی اور دیہاتی اثرات دیکھتے تھے جبکہ ان کی فارسی زبان شہری تہذیب و تمدن کے اعلیٰ معیارات کی حامل تھی۔"(۳)

مرزا مظہر جان جاناں:

اٹھارہویں صدی کے اس تہذیبی و سیاسی دور زوال میں اسلامی ادب کی اولین لہر مجدد الف ثانی کے سلسلہ کے بزرگ مرزا مظہر جان جاناں نے پیدا کی۔ انہوں نے ایہام گوئی اور ہندی و سنسکرت کے اثرات کے خلاف رد عمل ظاہر کیا اور تازہ گوئی کا آغاز کیا۔ انہوں نے اردو میں عربی و فارسی کے الفاظ کو جائز قرار دیا۔ معروف اردو ادب کی کتاب میں ہے کہ:

"مغلوں کا زوال عجمی تحریک کا زوال تھا اور مظہر جان جاناں اس زوال پر مستقل نوحہ کناں نظر آتے ہیں۔"(۴)

مرزا مظہر کی شاعری میں اپنے زمانے کا عکس جھلکتا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کو جو مصائب درپیش تھے ان کی غزلیں اس احساس کی حامل ہیں۔ نجم الاسلام رقمطراز ہیں:

" اس میں شک نہیں کہ وہ پہلے اردو کے شاعر ہیں جن کی غزلوں میں اتنی کامیابی کے ساتھ سیاسی رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔"(۵)

مرزا مظہر کی کوششوں سے شمالی ہند کا شعری منظر تیزی سے تبدیل ہوا سیاسی و تہذیبی زوال کی فضا میں مرزا مظہر اور ان کے تلامذہ میں ایک حوصلہ مندی پیدا ہوئی۔ اردو شاعری ایک نئی تخلیقی فضا میں سانس لینے لگی اور تازہ گوئی کی لہر شمالی ہند میں چلنے لگی۔ اردو شاعری میں شعریت کا ایک نیا احساس پیدا ہوا۔ مرزا مظہر بہاء الدین نقشبند کی اولاد میں سے تھے۔ وہ فارسی وار دو کے شاعر تھے اور روحانی رشد و ہدایت کا مرکز تھے۔ انہوں نے اردو شاعری کو مجاز و حقیقت کے امتزاج کے ساتھ واردات قلبی کا آئینہ خانہ بنانے کی تلقین کی۔ اس طرح داخلیت پسندی اردو شاعری کی ایک مستقل خصوصیت بن گئی۔ مرزا مظہر کی تازہ گوئی کی تحریک کے متعلق اردو ادب کی تحریکیں میں لکھا ہے کہ

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

،،داخلی طور پر یہ ہندوی زبان اور تہذیب کے خلاف اسلام ایرانی تہذیب کی پیش قدمی تھی جسے مسلمان شعراء نے کامیاب بنانے میں گہری دلچسپی لی۔"(۶)

مرزا مظہر نے اردو کو سنسکرت اور ہندی کے اثرات سے پاک کرنے کو سیاسی اور مذہبی فریضہ سمجھا۔ اس حوالے سے وہ نہ صرف اردو میں اسلامی ادب کے اولین معمار قرار دیئے جا سکتے تھے بلکہ ان کے وضع کردہ شعری اسلوب کی بناء پر اردو مقامی لسانی روایت سے بلند ہو کر انفرادی شناخت اور وجود کی حامل بنی۔ اس طرح اردو اپنے ارتقاء کی منزل ہی میں فارسی زبان وادب کے اسالیب کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب وثقافت سے ہم آہنگ بھی ہو گئی۔

خواجہ میر درد:

مرزا مظہر کی شعری تحریک کے اثرات بعدازاں خواجہ میر درد کے ہاں نمایاں ہوئے۔ درد کی متصوفانہ شاعری کی بنیاد اور ان کے خیالات کا سرچشمہ شیخ مجدد کے نظریات تھے انہوں نے اردو شاعری کو جن صوفیانہ مشرب سے آشنا کرایا وہ ایرانی اور ہندی افکار وخیالات کے بجائے شیخ مجدد کی احیائی تحریک کا اصلاح یافتہ مشرب تھا جس کی بنیاد توحید پر تھی۔ شاہ گلشن کے مریدوں میں ولی کے علاوہ خواجہ محمد ناصر عندلیب بھی تھے۔ عندلیب کے صاحب زادے اور جانشین خواجہ میر درد تھے۔ اس طرح شاہ گلشن کا فیض خواجہ عندلیب کے واسطے سے میر درد تک بھی پہنچا۔ خواجہ عندلیب نے فارسی کو اپنے خیالات کا ذریعہ بنایا مگر اردو پر آپ کے اثرات اس طرح مرتب ہوئے کہ آپ کے دونوں بیٹے خواجہ میر درد اور خواجہ میر اثر اردو کے نامور شاعر ہوئے۔ خواجہ میر درد نے دلی کے آشوب' شدید تباہی اور خون ریزی کے باوجود دلی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خاندان اٹھارہویں صدی میں شمالی ہند کے برگزیدہ صوفی خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ درد خود بھی دلمی اور عملی سطح پر تصوف کی دنیا میں بلند مقام کے مالک تھے۔ انہوں نے تقریباً 1750ء کے زمانے میں درویشی کا مسلک اختیار کیا۔ وہ اپنے دور کی تہذیب اور اور ادب اور شعر کی علامت تھے۔ اٹھارہویں صدی کا ہندوستان انہیں ایک باعمل اور نظریہ ساز صوفی کی حیثیت سے زیادہ جانتا تھا۔ تبسم کاشمیری کے لفظوں میں:

"خواجہ میر درد کا آستانہ اٹھارہویں صدی میں دلی میں تہذیبی، روحانی اور ادبی لحاظ سے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک ایسے دورِ ابتلا میں جب دلی کے شعراء گردش روزگار سے عاجز آ کر شہر سے ہجرت کر رہے تھے اور محفلیں اجڑ رہی تھیں خواجہ میر درد کی خانقاہ صاحبانِ ذوق کے لئے ایک ادبی اور روحانی پناہ گاہ بنی ہوئی تھی۔"(۷)

صوفیانہ شاعری میں درد کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے پہلی بار صوفیانہ خیال اور مضامین کو استعمال کر کے اردو شاعری کو اسلامی فکر و نظر سے مالامال کر دیا۔ اس طرح اردو میں صوفیانہ شاعری کی روایت کو استوار کیا۔ اسی روایت کے زیر اثر میر

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

حسن نے اپنی مثنوی ''رموز العارفین'' میں مولانا روم کی ''مثنوی'' کی بحر اور طرز کو اختیار کیا اور اس طرح انہوں نے حکایات کے پیرائے میں تصوف، حکمت اور معرفت کے مضامین کو بیان کیا۔ درد کی صوفیانہ روایت کے زیر اثر قائم چاند پوری نے (متوفی 1793ء) ایک مثنوی ''رمز الصلوۃ'' کے عنوان سے لکھی۔ یہ مثنوی ۲۵۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں مذہبی اور صوفیانہ نکات کی وضاحت قصے، حکایت اور تمثیل کے پیرائے میں کی گئی ہے۔ نماز میں خیالات کی یکسوئی کے لئے ایک عورت کی تمثیل پیش کی ہے جو اوپر نیچے پانی کے چند گھڑے سر پر رکھے ہوئے جا رہی ہے۔ راہ میں سہیلیوں سے باتوں، چشم و آبرو کی جنبش اور سو بازو کی حرکت کے باوجود گھڑوں کا توازن بگڑتا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دھیان برابر گھڑوں ہی طرف لگا رہتا ہے اور ان کی نگرانی کرتا ہے۔ مثنوی کے علاوہ غزل میں بھی قائم نے حکمت و معرفت کے مضامین کو پیش کیا ہے۔ یہاں بھی حاتم اور درد کا فیضان نمایاں ہے۔

کشا کش موج سے کرنا کوئی مقدور ہے خس کا
میں اور تیری رضا پیارے جدھر چاہے ادھر لے جا (۸)

مومن خان مومن:

سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد و اصلاح اس دور کے مسلمانوں کے لئے ایک مشعل راہ کا کام دے رہی تھی۔ اردو شعراء بھی ان جذبات سے متاثر تھے۔ حکیم مومن خان مومن اس سلسلے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ سید احمد بریلوی کے پر جوش مرید اور ان کی تحریک جہاد کے نقیب بھی تھے۔ مومن کی شاعری میں جہاد کی تڑپ اور شہادت کی آرزو ان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ عوام الناس کے جذبہ و احساس کی ترجمان ہے، جو امید و بیم کے عالم میں اس تحریک کی کامیابی پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ مومن، شاہ عبد القادر کے مدرسے کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے اور عربی، فارسی، اردو، منطق، حدیث اور علوم اسلامی میں درس گاہ کامل رکھتے تھے۔ مومن آغاز ہی سے سید احمد بریلوی کے حلقہ اثر میں آچکے تھے۔ اسی بناء پر انہوں نے تقلید پرستی اور تصوف کو شدت سے رد کیا۔ انہوں نے سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کی شان میں شعر کہے اور ان کی تحریک جہاد کی تعریف میں مثنوی جہاد بھی لکھی۔ سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد نے مسلمان قوم کے جذبہ جہاد کو متحرک کیا۔ تحریک جہاد کا مقصد سکھوں اور انگریزوں کے خلاف قوم کو جہاد کے لئے تیار کرنا اور برصغیر میں اسلامی نظریات کا فروغ اور اوہام پرستی کا خاتمہ تھا۔ اس اعتبار سے یہ اپنے عہد کی ایک اہم ترین فکری تحریک تھی۔ اس تحریک نے مذہب، معاشرت اور ادب تینوں شعبوں کو متاثر کیا۔ اس عہد کے شعراء میں سے حکیم مومن خان مومن اس تحریک سے زیادہ متاثر تھے۔ انہوں نے ''مثنوی بمضمون جہاد'' اس وقت لکھی جب سید احمد شہید سکھوں سے جہاد کر رہے تھے۔ اس مثنوی میں جہاد کی تلقین اور کفار کے خاتمے کے ساتھ ساتھ شہادت کی سچی آرزو بھی موجود ہے۔ مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پلا مجھ کو ساقی شراب طہور
کہ اعضا شکن ہے خمار فجور
کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

کہ آ جائے بس نشہ اسلام کا
ہوا مجتمع لشکر اسلام کا
اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
امام زمانہ کی یاری کرو
خدا کے لیے جاں نثاری کرو
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے
ملا دے امام زماں سے مجھے(۹)

ہم مومن کے بارے میں یہ نہیں کہتے کہ اسے اسلامی شاعر مان لیا جائے۔ لیکن اس کی ''مثنوی جہاد'' کو اسلامی ادب کے دائرے سے خارج کرنا ممکن نہیں۔ یہ مثنوی مذہب کے خودساختہ جامد افکار کے بجائے تحریکی جذبات کی آئینہ دار ہے۔''مثنوی جہاد'' کے خیالات، جوش و خروش اور ولولہ عمل کے متعلق ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے لکھا ہے:

> ''یہ مثنوی اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ اردو شاعری میں ایک سیاسی تحریک کے سلسلے میں ایک بڑے شاعر کی پہلی شعوری کاوش کا نتیجہ ہے اور اس کے آہنگ میں قلب مومن کے علاوہ اور بہت سے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن سنائی دے رہی ہے''(۱۰)

مومن کی ''مثنوی جہاد'' اس سیاسی شعور کی پیداوار ہے جسے سید احمد شہید نے اجتماعی بیداری کے سلسلے میں پروان چڑھایا تھا۔ اس مثنوی کی اہمیت یہ ہے کہ اسلامیان ہند کے سیاسی شعور کو ایک قادر الکلام شاعر نے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے مومن خان مومن اردو کے پہلے قومی شاعر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ محمد حسن عسکری نے درست لکھا ہے کہ:

> '' سید احمد بریلوی اور اسمٰعیل شہید کی پوری تحریک نے۔۔۔ہندوستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک سب مسلمانوں کو براہ راست پیغام دیا تھا اور اس کے اثر سے ادب و شعر کے حلقے بھی اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ مومن کی مثنوی جہاد اس بات کی بین شہادت ہے کہ شاعروں تک کو قوم کی صورت حال کا کیا شدید احساس تھا۔''(۱۱)

الطاف حسین حالی:

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

حالی کے زیر اثر مسلمانوں کا زوال و پس ماندگی اور تاریخ اسلام اردو کے شعری موضوعات بن گئے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں شاعری کو قومی و ملی مقاصد کی نشرو اشاعت کا ذریعہ بنایا گیا۔ اب اردو شاعری مشاعروں کے ساتھ ساتھ قومی اجتماعات اور جلسوں میں عوام کے قلب و ذہن تک بھی پہنچنے لگی۔ مسدس حالی اردو میں پہلی طویل قومی نظم ہے یہ ایک عہد آفریں کارنامہ تھا جس نے سرسید کی اصلاحی تحریک کو مسلمانوں میں مقبول بنانے میں اہم حصہ لیا۔ اس میں مسلمانوں کی مذہبی، تہذیبی، اور علمی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ ظہور اسلام اور مسلمانوں کے زوال کی کہانی باہم شیر و شکر ہوگئی ہے۔ ''مسدس مدو جزر اسلام'' 1879ء میں تخلیق ہوئی اور چھپتے ہی قبول عام کا درجہ حاصل کر گئی۔ حالی کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اگر کسی ایک نظم سے کیا جاسکتا ہے تو وہ نظم بلاشبہ ''مسدس مدو جزر اسلام'' ہے۔ اس نظم کا موضوع اگرچہ مسلمانان پاک و ہند ہیں۔ لیکن حالی نے مسلم قومیت کی بنیاد وطن کو نہیں اسلام کو بنایا ہے۔ یہ نظم قوم کی تاریخ کو عرب میں ظہور اسلام سے شروع کرتی ہے۔ پھر حضرت محمد کی سیرت، شرق و غرب میں مسلمانوں کا اخلاق و کردار اور جہالت و غفلت کے ہاتھوں اسلامیان ہند کی دردناک صورت حال کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ نظم میں جذبہ و تخیل کی کارفرمائی کے باوجود حالی نے حقائق کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ شیخ محمد اکرم لکھتے ہیں:

> ''اہل بصیرت جانتے ہیں کہ مسلمانان ہند کی بیداری میں ''مسدس حالی'' نے بھی علی گڑھ کے قیام سے کچھ کم کام نہیں کیا۔ سرسید خود اس کتاب کی اہمیت سے واقف تھے۔ مسدس ان کے ایما پر لکھی گئی۔ اور وہ کہتے ہیں ''بیشک میں اس کا محرک ہوا ہوں اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو دنیا سے کیا لایا۔ میں کہوں گا کہ میں حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔''(۱۲)

حالی نے اس دور کے مسلمانوں کی ابتر حالت کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ سخت یاس انگیز تھا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا تجزیہ درست ہے کہ شاعر کا مقصد خوابیدہ قوم کو کچوکے لگا کر جھنجھوڑنا اور غیرت دلانا تھا۔ لیکن اس طرز بیاں نے مقصدیت کو کسی قدر ٹھیس بھی پہنچائی کیونکہ جہاں مقصد قومی تعمیر و ترقی ہو، وہاں یاس و بے دلی پھیلانا خود مقصدیت کے لیے سخت مضر بلکہ مہلک طریق کار ہوتا ہے۔ حالی بلاشبہ ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کے مرثیہ خواں اور شعری حوالے سے اقبال کے پیشرو تھے۔ اس طرح حالی سے اردو ادب میں نئے دور کا آغاز ہوا ''مسدس مدو جزر اسلام'' اور ''شکوہ ہند'' سے متاثر ہو کر چند دوسرے شعراء نے بھی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ شوق قدوائی کی ''مسدس قومی'' (1889ء) نظم طباطبائی کا ''ساقی نامہ'' (خطاب اہل اسلام) صفی لکھنوی کی قومی نظمیں اور اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں ''آثار سلف'' (1889ء) ''جریدہ عبرت'' (1885ء) اس سلسلے میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ اردو نظم نگاری کے سلسلے میں حالی میر کارواں تھے۔

شبلی نعمانی:

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

مولانا شبلی نعمانی 1883ء میں علی گڑھ آئے اور حالی کی طرح سر سید احمد خان کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کی اصلاحی تحریک کے ایک نامور رکن بن گئے۔ اسی تحریک کے زیر اثر انہوں نے ملت کی بربادی کا درد اور احساس قبول کیا۔ شبلی نے شاعری کو اپنا مستقل شعار نہیں بنایا۔ شبلی کا اصل مقام تاریخ نگاری تھا۔ تاہم انہوں نے ناموران اسلام کی تاریخ کے علاوہ بعض قومی مسائل اور واقعات پر بھی طبع آزمائی کر کے اردو شاعری میں قابل قدر اضافہ کیا۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً شاعری کی طرف رجوع کیا۔ شبلی نے قومی زوال پر حالی کی طرح مرثیہ خوانی نہیں کی' تاہم وہ حالی کی مرثیہ خوانی سے متاثر ضرور ہوئے۔ شبلی کی مثنوی ''صبح امید'' اسی تاثر کا نتیجہ ہے یہ 1885ء کے زمانے کی تخلیق ہے اور اس مثنوی میں وہ یاس انگیز لے نہیں پائی جاتی جو ''مسدس حالی'' کے رگ وپے میں جاری وساری ہے۔ مثنوی ''صبح امید'' کے چند اشعار دیکھیے:

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام
جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی
جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال
کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کر دیے تھے چراغ جس نے
قیصر کو دیے تھے داغ جس نے(۱۳)

بیسویں صدی کے آغاز پر ملک نے سیاسی اعتبار سے نئی کروٹ لی' اس سے اور اتحاد اسلامی کے جذبات اور احساسات سے متاثر ہو کر شبلی نے کئی نظمیں اور قطعات کہے۔ مساوات اسلام' عدل فاروقی کا ایک واقعہ' عدل جہانگیری' خطاب بہ احرار' جزرو مد وغیرہ۔ جنگ طرابلس وبلقان پر انہوں نے ایسی نظمیں لکھیں کہ اسلامیان برصغیر کے لہو کو گرما دیا۔ یہ دور شبلی کی شاعری کا چوتھا اور امتیازی دور ہے۔ یہ دور 1908ء سے شروع ہو کر 1941ء تک قائم رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی دنیا میں انقلاب برپا تھا اس وقت مسلمانوں میں یورپ کی طرف سے عموماً اور برطانیہ کی طرف سے خاص طور پر مسلمانوں کے دل جلے ہوئے تھے۔ اس پر آشوب زمانے کے نمائندہ شاعر مولانا شبلی تھے۔ اس زمانے میں شبلی کی نظمیں ''زمیندار'' (لاہور) ''ہمدرد'' (دلی) ''مسلم گزٹ'' (لکھنو) اور ''الہلال'' (کلکتہ) میں چھپتی تھیں۔

اکبر الٰہ آبادی:

لسان العصر سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی (1845ء۔ وفات 9 ستمبر 1921ء) اردو شاعری کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اکبر کی شاعری اسلامیان برصغیر کی سیاسی اور سماجی زندگی کے کم وبیش نصف صدی کے لیل ونہار کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے ربع اول کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو گا جس کی بھرپور ترجمانی

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

ان کے کلام میں موجود نہ ہو۔ ابتدائی غزل گوئی کے بعد ان کی شاعری کا حقیقی رنگ ''اودھ پنچ'' کے اجراء (1877ء) سے شروع ہوا ہے۔ اکبر نے پہلی بار طنز و مزاح کو اصلاح قوم کے لئے استعمال کیا۔ ان کے مزاحیہ رنگ طبیعت کو ''اودھ پنچ'' میں جولانیاں دکھانے کے مواقع میسر آئے۔ اکبر کی شاعری کا سب سے بڑا موضوع قومی و ملی تہذیب و معاشرت ہے جو اس دور میں مغربی تہذیب و معاشرت کے تند و تیز ریلوں کی زد پر تھی۔ ان کا دل قومی درد و احساس سے لبریز ہو چکا تھا اور یہی تڑپ ان کی شاعری میں رواں دواں ہے۔

نیشنل وقعت کے گم ہونے کا ہے اکبر کو غم
آفیشل عزت کا اس کو کچھ مزا ملت نہیں (۱۴)

اکبر کو ان کی زندگی میں ''لسان العصر'' کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے لکھا ہے:

> ''مخزن'' کے اہل قلم (شیخ عبدالقادر، میر غلام بھیک نیرنگ، علامہ اقبال، ظفر علی خان وغیرہ) کی طرف سے اکبر کو لسان العصر کا لقب دیا جانا، ان کی عظمت اور قومی خدمات کا اعتراف تھا۔ لسان العصر اکبر نے حریت فکر کی جو شمع روشن کی تھی بیسویں صدی میں اس کا اجالا دور دور تک پھیل گیا۔ آزادی کی منزل کی طرف یہ ایک شاعر کی رہنمائی تھی۔'' (۱۵)

سرسید کی تحریک کا بھرپور رد عمل، اکبر الہ آبادی کی شاعری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ افغانی کے نظریات سے متاثر ہونے والوں میں اکبر الہ آبادی بھی شامل ہیں۔ اکبر نے مادیت، عقلیت اور جدیدیت کے استعاروں کو تمسخر کا نشانہ بنایا۔

علامہ اقبال:

علامہ اقبال سے پہلے اردو شاعری میں تحریکی عنصر، قومی شعور اور جوش ایمانی کی حد تک رہا۔ انہوں نے ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' سے بہت پہلے اپنی شاعری میں اسلام کی دعوت پیش کی۔ اقبال کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی اسلامی فکر نے بھی ارتقاء کے مراحل طے کیے۔ 1905ء سے 1908ء تک قیام یورپ کے زمانے میں جب انہوں نے قریب سے مغربی ممالک کو جغرافیائی حدود پر مبنی قومیت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے جنگ آزما دیکھا تو انہیں صرف اسلام ہی کی صورت میں ایک ایسا نظام نظر آیا جو نوع انسانی کی فلاح و بہبود کی ضمانت دے سکتا تھا۔ اس یقین کے بعد وہ برصغیر میں بھی دو قومی نظریے کے زبردست حامی بن گئے۔ 1930ء میں انہوں نے تصور پاکستان پیش کر دیا۔ قیام پاکستان علامہ اقبال کا سیاسی کارنامہ ہے اقبال نے سیاست، معاشرت اور تعلیم کے ضمن میں جو کچھ لکھا ہے اس کا منبع اسلام بنتا ہے اسی طرح ان کے تصورات عشق و خرد، مرد مومن اور فقر و توکل وغیرہ کا مطالعہ بھی اسلامی فکر کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔ 1908ء کے بعد اقبال کی شاعری میں ملی وحدت اور اسلامی قومیت کا تصور نمایاں ہے۔ اس دور کی نظموں میں "خطاب بہ نوجوانان اسلام"

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

طلبائے علی گڑھ کے نام، ترانہ ملی، شمع و شاعر، طلوع اسلام، شکوہ، جواب شکوہ اور خضر راہ وغیرہ بڑی انقلاب آفریں نظمیں ہیں۔ان منظومات میں ''خضر راہ'' خاص طور پر ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ نظم کے اشعار دیکھیے:

اے تری چشم جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
کشتی مسکین، و جان پاک و دیوار یتیم،
علم موسی بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا دوش
زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقہ دیرینہ چاک
نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
گرچہ اسکندر رہا محروم آب زندگی
فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤنوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفٰی
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش
آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے(۱۶)

اس نظم میں شاعر نے خضر کی زبان سے دور حاضر کے سیاسی و معاشی نظریات، زندگی کے درخشاں مفہوم، سلطنت و حکومت، سرمایہ و محنت کی کش مکش اور دنیائے اسلام کی زبوں حالی جیسے موضوعات پر اسلامی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی ہے ''طلوع اسلام'' میں انہوں نے مسلمانوں کو ایمان وایقان کا درس دیا ہے اور اسے دنیا کی بہترین قوم اور معمار جہاں قرار دیا ہے۔شاعر مشرق نے ''بانگ درا'' میں اسلام کے بعض تاریخی واقعات کو بڑے ولولہ انگیز پیرائے میں نظم کیا ہے فاطمہ بنت عبداللہ، غلام قادر وہیلہ، جنگ یرموک کا ایک واقعہ، بلاد اسلامیہ، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، صدیق رضی اللہ عنہ، وغیرہ نہایت حریت آموز اور روح پرور نظمیں ہیں۔ اس طرح علامہ اقبال نے اردو شاعری کا مزاج بدل دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبال ایک عہد آفریں شاعر ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اسلامیان برصغیر اور اردو شاعری کے مردہ جسم میں زندگی کی روح پھونک دی ہے۔

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

اقبال کی شاعری اور اسلامی فکر نے ایک واضح شکل اس وقت اختیار کی جب انہوں نے "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" لکھی۔ اس سے پہلے ان کی شاعری محض عظمت رفتہ کا مرثیہ تھی۔ "اسرار و رموز" کے بعد اردو شاعری ملت اور افراد ملت کے لئے ایک واضح نصب العین کا پیغام سناتی ہے۔ آج ہمارے یہاں کے ادب، صحافت اور خطابت میں اسلامی فکر اور تحریک کے جو دھارے نظر آرہے ہیں، وہ اقبال ہی کے طفیل ہیں، اقبال نے حالی کے احساس زیاں کو یاسیت سے موڑ کر قوم کے لئے خود شناسی اور خود نگری کا ساماں بنا دیا۔ انہوں نے شاعری کے ذریعے اسلامیان ہند کے علمی و ادبی اور دینی حلقوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> " انہوں نے دنیا کے لیے ایک مثالی نظام تجویز کیا جس میں خالص اسلامی فکر سے تصوراتی رنگ بھرے۔ سب سے پہلے انسان کامل کی نشوونما، پھر ایک اعلٰی اور مثالی سوسائٹی کی تشکیل، یہ اقبال کی فکر کے دو اہم اجزاء ہیں۔ یہ افلاطون کی جمہوریت سے مختلف، سر ٹامس مور کی جنت الحمقائ (Utopia) سے زیادہ عملی، ابراہیم الجیلی کے روحانی "الانسان الکامل" سے بلند تر اور نیٹشے کے مادی اور تخریبی "مافوق الانسان" کے بر عکس روحانی اور اخلاقی شخصیت کا تصور تھا۔"(۱۷)

علامہ اقبال نے احیائے دین کو اپنا مقصد بنایا۔ انہوں نے اسلامی افکار کی مثبت تشریح میں مغربی افکار سے بھی استشہاد کیا ہے۔ اقبال کے فکری ماخذ میں قرآن وحدیث کے بعد رومی کی مثنوی سب سے بڑا ماخذ ہے۔ ان کے نزدیک اسلام ایک مثالی معاشرہ کی اساس بن سکتا ہے۔ انہوں نے قرآن پاک کے دائمی، ابدی اور عالم گیر نظریات کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ ان کی شاعری میں احیائے دین کی پوری تحریک سمٹ آئی۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ اسلام کی انقلابی تحریک اردو، فارسی شاعری کو ایک ایسی انقلابیت سے نواز سکتی ہے کہ جس کی مثال دور حاضر کی دوسری زبانوں میں نہیں مل سکتی۔ اقبال کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے احیائے دین کی نئی تحریکات کو اپنے کام کی ابتداء کرنے کے لئے ذہنی و فکری طور پر ہموار میدان عطا کر دیا۔

علامہ اقبال نے بیسویں صدی میں ان بالغ نظر مسلمانوں کی نمائندگی کی جنھوں نے مغرب کا ناقدانہ اور حقیقت پسندانہ مطالعہ کیا۔ انہوں نے مغربی علوم وفنون و اخلاقیات پر تنقیدی نظر ڈالی اور قوم کی غلامانہ ذہنیت کو دور کر کے اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں جو کام مولانا روم نے "مثنوی" کے ذریعہ انجام دیا تھا، اسے اس دور میں اقبال نے اولاً "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" اور پھر "جاوید نامہ" اور "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے ذریعہ انجام دیا۔ "اسرار خودی" کا مرکزی تصور ایمان کی قوت سے ایک نئے انسان، مرد مومن کی تشکیل ہے۔ جب کہ "رموز بے خودی" میں فرد اور ملت کا ربط، خلافت الٰہی کی تشریح، خودی کی پرورش اور نمو میں تاریخ کے حصہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

حفیظ جالندھری:

حفیظ جالندھری اس دور کے اہم شاعر ہیں۔ وہ 14 جنوری 1900ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے شاعری میں فارسی کے معروف شاعر مولانا غلام قادر گرامی کی شاگردی اختیار کی۔ انہوں نے کچھ نظمیں حب الوطنی کے جذبے سے متاثر ہو کر تخلیق کیں مثلاً ''نیرنگ فرنگ''،''فریب آزادی'' وغیرہ۔ ان کے حسن و عشق کے گیتوں میں بھی کہیں کہیں سماجی پس منظر کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ ان کا اصل شعری کارنامہ مثنوی ''شاہنامہ اسلام'' ہے جو چار جلدوں اور تقریباً آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں سیرت طیبہ اور اسلام کے درخشندہ ماضی کو نظم کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی قومی و ملی شعور کی عکاس ہے ''شاہنامہ اسلام'' کو حالی، شبلی اور ظفر علی خان کے اس تاریخی سلسلہ منظومات کی ایک اہم کڑی سمجھنا چاہیے جس نے ملک میں اسلامی قومیت کے شعور کو ابھارنے میں نمایاں حصہ لیا۔

''شاہنامہ اسلام'' میں واقعات بھی ہیں اور جذبات بھی، حفیظ کی شاعری میں ملی احساسات ہر جگہ موجود ہیں۔ وہ مسلمانان ہند کی ہر تحریک سے متاثر ہوئے اور تحریک خلافت سے لے کر تحریک کشمیر تک' کے ترجمان بنے۔ حفیظ نے ''شاہنامہ اسلام'' کی چاروں جلدیں 1926ء سے 1947ء کے عرصے میں لکھیں۔ اس مثنوی کا آغاز ظہور آدم سے ہوتا ہے اور اس کی چوتھی جلد جنگ احزاب پر ختم ہوتی ہے حفیظ نے سیرت طیبہ کی مرقع نگاری کو اپنا مقصد ٹھہرایا۔ وہ حضور اکرم کی محبت کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتے تھے اور اسلام کی خدمت کرنا اپنا فرض گردانتے تھے۔ جس طرح حالی نے ''مسدس'' لکھ کر ملی و اسلامی شاعری کا آغاز کیا' اور علامہ اقبال نے اسلامیان ہند کو بیداری کا پیغام دیا۔ اسی طرح حفیظ جالندھری نے بھی اسلامی تاریخ کو اور خاص طور پر حضور اکرم کی زندگی کے واقعات کو نظم میں ڈھالا اور ''شاہنامہ اسلام'' جیسی معرکۃ الآرا مثنوی تخلیق کی۔ حفیظ جالندھری کی خواہش تھی کہ جس طرح فردوسی نے ایران کو زندہ کیا اسی طرح میں ایمان کو زندہ کر دوں۔ یہی ''شاہنامہ اسلام'' کا تخلیقی محرک ہے جس کا تذکرہ حفیظ نے ذیل کے اشعار میں کیا ہے:

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمت اسلام کر جاؤں
مسلمانوں پہ ہے مردہ دلی چھائی ہوئی ہر سو
سکوت مرگ نے چادر ہے پھیلائی ہوئی ہر سو(۱۸)

حفیظ الرحمٰن احسن دعوتی ادب کی تحریک کے اہم شاعر اور نقاد ہیں۔ وہ تحریک کے ترجمان ''ماہنامہ سیارہ'' کے مدیر تھے۔ ان کے ہاں حمد و نعت کے علاوہ تغزل کا کلاسیکی رچاؤ موجود ہے۔ ان کے کلام میں قدیم اساتذہ سخن کی شعری خصوصیات کی گونج سنائی دیتی ہے۔

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

طاہر شادانی بھی اردو شعر و ادب میں اسلامی قدروں کے علمبردار ہیں۔ وہ ادبی حلقوں میں معروف رہے ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''شعلہ نمناک'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مختصر مجموعہ کلام میں حمد و نعت سے لے کر نغمات وطن اور مرحوم بزرگوں اور دوستوں کے نوحوں تک سبھی کچھ شامل ہے۔ ان کا کلام بامقصد اور زندگی کا ترجمان ہے۔

اسلامی ادب کی تحریک سے وابستہ اہل قلم میں آسی ضیائی تنقید اور شاعری میں ایک اہم نام ہے۔ 1946ء میں مسلم یونیورسٹی میں اسلامی فکر کے حامل ادیبوں کا ایک حلقہ وجود میں آیا۔ آسی ضیائی اس حلقے کے روح رواں تھے۔ نعتیہ شاعری میں ان کی مختصر کتاب ''حسرت نعت'' اردو شاعری میں ایک منفرد اضافہ ہے۔

مختصر یہ کہ ہر دور میں ملی و اسلامی تحریکات اردو شعر و ادب پر پڑتے رہے ہیں اور ہر صنف میں اسلامی رجحانات کی پیش کش کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ مجدد الف ثانی کی تحریک تجدید احیائے دین کے زیر اثر مرزا مظہر جان جاناں نے ملی و اسلامی ادب کا سنگ بنیاد رکھا، درد نے اس روایت کو صوفیانہ رنگ عطا کیا۔ سید احمد شہید و شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک جہاد کے لئے مومن خان مومن نے قلمی جہاد کیا اور ''مثنوی جہاد'' لکھ کر اردو شاعری کو تحریکی رچاؤ عطا کیا۔ سر سید نے دو قومی نظریہ کا شعور اجاگر کیا تو اس کے زیر اثر حالی نے قومی و ملی شاعری کو شعر و سخن کا مرکزی دھارا بنادیا۔ شبلی اور اکبر الٰہ آبادی نے اردو شاعری کو اسلامیان برصغیر کے فکری، تہذیبی اور سیاسی احیاء کا ذریعہ بنایا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں ظفر علی خان اور علامہ اقبال نے شاعری سے اور ابوالکلام آزاد نے نثر سے تعمیر ملت کا کام کیا۔ یہ الگ بات کہ اس ادب کو اسلامی ادب کے نام سے پیش نہیں کیا گیا۔ حالی، شبلی، اکبر، مولانا ظفر علی خان، ابوالکلام اور علامہ اقبال نے جو ادب تخلیق کیا، وہ اسلامی ادب نہیں تو اور کیا ہے ؟ انہی اکابر کے فکری و ادبی کارنامے اسلامی ادب کی تحریک کا روشن پس منظر بنتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ملی و اسلامی شعور آگہی کا یہ دھارا اسلامی ادب کی تحریک کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا۔

اردو نثر میں دعوتی ادب کی روایت:

اردو ادب کا مزاج دعوتی تہذیب و روایات کا پروردہ ہے۔ اردو کی پوری ادبی تاریخ میں، تاریخ انسانی کی طرح دو ہی تصورات کی کش مکش جاری رہی ہے۔ تعمیری اور تخریبی، روحانی اور مادی بالفاظ دیگر اسلامی اور غیر اسلامی۔ شمالی ہند میں سترھویں صدی عیسوی سے پہلے اردو کو ایک ادبی زبان کے طور پر سنجیدگی کے ساتھ کبھی اختیار نہیں کیا گیا۔ مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ فارسی کا عمل دخل بھی ادبی فضا سے کم ہونے لگا۔ نتیجتاً اردو زبان کو اہمیت ملنا شروع ہوئی۔ اس وقت تک اردو میں نثر لکھنا ایک قسم کی توہین سمجھا جاتا تھا۔

شمالی ہند میں اردو نثر کی پہلی کتاب فضلی کی ''دہ مجلس'' یا ''کربل کتھا'' ہے۔ مذہبی مقاصد کے لئے محمد شاہی عہد میں لکھی گئی۔ یہ کتاب فارسی تصنیف ''روضۃ الشہداء'' کا اردو ترجمہ ہے۔ فضلی نے یہ کتاب اردو میں اس لئے منتقل کی کہ فارسی تصنیف کے معانی عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ فضلی کا یہ ترجمہ اس عہد کے مقبول فارسی اسلوب نثر ''سہ نثر ظہوری'' کے تتبع میں لکھا گیا۔ اسی بناء پر انور سدید کا کہنا یہ ہے کہ:

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

"فضلی اردو کے بجائے فارسی اسلوب سے زیادہ متاثر تھا،اس کے جملے گنجلک اور نثر کا اسلوب مقفیٰ ہے۔۔۔۔چنانچہ اسے اردو نثر کا نمائندہ اسلوب قرار دینا ممکن نہیں۔"(۱۹)

یہ اردو نثر کی خوش بختی ہے کہ ایک بڑے شاعر مرزا رفیع سودا کے دیوان مرثیہ کا دیباچہ اردو نثر میں ہم تک پہنچا ہے۔ یہ دیباچہ اس دور کی نثر کا ایک اور نمونہ پیش کرتا ہے۔ سودا نے اردو نثر کو فارسی نثر کے ہم پایہ بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ سودا کا اسلوب بھی "سہ نثر ظہوری" کی تقلید ہے مگر یہ اسلوب آئندہ اردو نثر میں متروک ہو گیا۔ سودا کے بعد معرب اور مفرس اسلوب اور ثقیل و پیچیدہ عبارت میں "نو طرز مرصع" بھی لکھی گئی۔ یہ نثر لکھنوی طرز احساس کی نمائندہ ہے۔ بقول انور سدید:

"نو طرز مرصع، کا جادو اثر اسلوب ایک روایتی معاشرے کا آخری تہذیبی عکس ہے۔ یہ روایت ٹوٹی تو اس اسلوب پر بھی زوال آگیا۔"(۲۰)

دکن میں اردو نثر کے فروغ میں صوفیائے کرام کے مذہبی، تبلیغی اور صوفیانہ رسائل نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ شمالی ہند میں یہی خدمت شاہ مراد اللہ انصاری، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر کے اردو تراجم قرآن حکیم نے سرانجام دی۔ اس عہد میں اردو نثر کے اطراف سے تصوف کا حصار ڈھایا جانے لگا اور اس کی بجائے مذہب کے عملی پہلو، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ کو اہمیت حاصل ہونے لگی۔ سب سے پہلے شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی نے 72-1771ء میں "پارہ عم" کی تفسیر اردو میں لکھی۔ یہ تفسیر "تفسیر مرادیہ" کے نام سے کئی بار چھپ چکی ہے۔ اس کا تاریخی نام "خدائی نعمت" ہے اس کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں:

"تفسیر مرادیہ" سے پہلے کوئی ایسی مفصل اردو تفسیر نہیں لکھی گئی تھی۔ اس لئے اسے قرآن مجید کی پہلی اردو تفسیر کہنا چاہئے"(۲۱)

شاہ مراد اللہ انصاری، نقشبندی کے مشہور شیخ اور مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ بھی تھے "شاہ مراد اللہ اور پاروں کی تفسیر بھی لکھنا چاہتے تھے مگر نہ لکھ سکے، کیونکہ ان کے شیخ طریقت مرزا مظہر جان جاناں نے منع فرمادیا تھا۔ "تفسیر مرادیہ" کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو بازار اور گلی کوچوں میں بولی جارہی تھی۔ بقول جمیل جالبی:

"اس کتاب میں اردو زبان کے جتنے الفاظ استعمال ہوئے ہیں شاید ہی اس دور کی کسی اور تصنیف میں استعمال ہوئے ہوں۔"(۲۲)

اس تفسیر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"پروردگار تعالیٰ جس وقت جس آدمی کا مرنا چاہتا ہے اس کی جان لینے کا حکم کرتا ہے، وہ آدمی اسی وقت مرتا ہے، پھر کسی حکیم طبیب کی، دانا عقلمندی کی،

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

کچھ تدبیریں کام آتی نہیں۔ ہزاروں دوا کریں، حکمت کریں، منتر جنتر
کریں، کچھ کام نہیں آتا۔ اس راہ سے سب لاچار، بے اختیار اپنے اپنے وقت
میں آخرت کی طرف چلے جاتے ہیں۔"(۲۳)

قرآن مجید کے اردو تراجم کے مخاطب عوام تھے اور انہی کی زبان وسیلہ اظہار بنی' اٹھارویں صدی کے نثری ادب نے انیسویں صدی کے نثری ادب کے لئے مضبوط بنیاد فراہم کی۔ اٹھارہویں صدی میں ایک طرف مقفیٰ و مسجع اسلوب نثر میں "کربل کتھا" اور "نوطرز مرصع" لکھی گئیں اور دوسری طرف "تفسیر مرادیہ" اور شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم قرآن حکیم سامنے آئے۔ تراجم قرآن مجید کا اسلوب سادہ و عام فہم ہے جو عوام تک اپنی بات پہنچانے کی ایک کوشش ہے۔ اس نثر میں اردو پن ہے اور اس میں عام بول چال کی زبان استعمال کی گئی ہے یہاں جملے کی ساخت پیچیدہ نہیں اور طویل جملے بھی نہیں ملتے۔ اور یہی اٹھارہویں صدی کا نمائندہ نثری اسلوب ہے۔ یہاں طرز بیاں پر نہیں بلکہ مقصدیت پر زور ہے۔

شاہ اسمٰعیل شہید نے عربی زبان میں ایک رسالہ "ردالاشراک" کے نام سے لکھا، جسکا موضوع رد رسوم و بدعات تھا۔ اس رسالے میں پہلے قرآنی آیات اور پھر اس کی تائید میں احادیث نقل کی گئی تھیں۔ بعدازاں شاہ اسمٰعیل نے تبلیغ اور افادہ عام کی غرض سے "ردالاشراک" کے باب اول کا ترجمہ و تشریح سادہ اور عام فہم اردو زبان میں لکھا اور اس کا نام "تقویۃ الایمان" رکھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"اول سننا چاہیے کہ شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب۔
لیکن اکثر لوگ توحید اور شرک کے معنی نہیں سمجھتے اور ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں۔
حالانکہ شرک میں گرفتار ہیں۔ سو اول معنی شرک و توحید کے سمجھنا چاہیے تاکہ
برائی اور بھلائی ان کی قرآن و حدیث سے معلوم ہو۔"(۲۴)

"تقویۃ الایمان" اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں لکھنے والا اپنی رائے کو بلا تخصیص خواص و عوام کے آگے لا سکتا ہے اور اس کی حمایت اور مخالفت میں (اردو نثر میں) بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے جاتے ہیں۔ اس طرح اردو نثر کو فروغ حاصل ہوا "تقویۃ الایمان" کی یہ خصوصیت بھی اردو نثر میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے کہ تحریر میں جوش خطابت کا سا انداز اور لطف موجود ہے۔ اس کتاب سے پہلے اردو کی علمی نثر اتنے جاندار اسلوب میں نہیں لکھی گئی "باغ و بہار" کی زبان علمی، تاریخی اور تحقیقی مواد کی پیش کش کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ میر امن کی زبان صرف داستاں سرائی ہی کے لیے موزوں ہے۔ مثلاً میر امن نے "گنج خوبی" لکھی جو مقبول نہ ہو سکی۔

مولانا ابوالکلام آزاد:

اردو نثر کو سب سے پہلے ابوالکلام آزاد نے اسلام کے نصب العینی تصور سے مالا مال کیا۔ انہوں نے نثر کو سیاسی، سماجی اور ملی تحریکوں سے وابستہ کر دیا اور احیائے اسلام کے لئے سیاسی شعور اور تحریکی عنصر کو لازمی قرار دیا۔ ابوالکلام آزاد نے یکم جون

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

1912ء کو کلکتہ سے ''الہلال'' کا اجراء کیا جس سے علمی اور سیاسی میدان میں ان کا غلغلہ بلند ہوا۔ علامہ شبلی نعمانی نے مسلمانوں کو ماضی پر اعتماد کرنا سکھایا اور ان کا تمدنی تاریخ سے تعلق قائم کیا۔ ابوالکلام آزاد نے اس میں تعمیری جارحیت کا رنگ پیدا کیا۔ انیسویں صدی میں اسلامیان ہند کے لئے نجات کی راہ مغربی تمدن کی پیروی تجویز ہوئی۔ بیسویں صدی میں مغربی فکر اور تہذیب و تمدن پر کڑی نکتہ چینی کے لئے وقف کر دیا۔ ان کے جوش اور ولولہ کی فراوانی اور خطیبانہ اسلوب بیاں نے اسلامیان ہند کو جگایا اور میدان میں لا کھڑا کیا۔ انہوں نے مذہبی احساس کو سیاسی شعور اور ادبی رنگ عطا کیا بقول خورشید احمد:

''مذہبی، سیاست اور ادبیت اس قوس قزح کے مختلف رنگ ہیں جسے ہم مولانا ابوالکلام آزاد کی رومانیت قرار دیتے ہیں۔''(۲۵)

انہوں نے ''تذکرہ''، ''ترجمان القرآن'' اور ''غبار خاطر'' میں شبلی کی انشاء پردازانہ نثر سے خوشہ چینی کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد دارالمصنفین سے متعلق نہ تھے مگر شبلی کے شاگردوں میں ان کا رتبہ تسلیم شدہ ہے۔ وہ اپنے استاد سے کئی معنوں میں مختلف تھے۔ شبلی بنیادی طور پر مصنف تھے اور بیشتر وقت تصنیف و تالیف میں مصروف رہے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے خطابت' سیاست اور صحافت سے ہمہ گیر اور موثر کام لیا۔ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے ذریعے انہوں نے خلافت علی منہاج النبوہ کی ایک منظم تحریک چلائی اور اپنا پیغام جدید تعلیم یافتہ لوگوں تک پہنچایا۔ انہوں نے اپنے بلند اور اعلیٰ خیالات کے لئے پر شوک اسلوب اختیار کیا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''ان کا بے پایاں جوش اور وسیع علم، معمولی الفاظ کے پیمانے میں نہیں سما سکتا۔''(۲۶)

شبلی کے بعد ابوالکلام آزاد پہلے بڑے مصنف ہیں جنہوں نے مذہبی تصانیف کا معیار بلند کیا اور جدید علمی نظریات سے مستفید ہوئے۔ ان کا بنیادی نظریہ احیائے اسلام تھا۔ انہوں نے اسلامیان ہند میں بیداری' جرات اور ہمت کے جذبات برانگیختہ کیے۔ ابوالکلام آزاد نے دین اسلام کی صداقت کا معیار مغربی عقلیت اور سائنسی قوانین کے بجائے اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا۔ وہ سرسید کے برعکس قدیم روایات کا احیاء چاہتے تھے اور شبلی کی طرح تاریخی و تہذیبی تسلسل کے قائل تھے۔ وہ عظمت رفتہ کے احیاء کو اپنا نصب العین قرار دیتے تھے اور عقل کے مقابلے میں وجدان اور عشق پر زور دیتے تھے۔

رسالہ "نگار":

مغرب میں چودھویں صدی سے انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے وہ ہمہ گیر انقلاب اپنی تکمیل کو پہنچ گیا جس کے نتیجے میں جدید انسان نے ''خدا'' کی جگہ استقرائی سائنس کی بنیاد پر فکر و عمل کی پوری دنیا از سر نو ترتیب دی۔ اب توجہ کا مرکز مابعد الطبیعات اور دینیاتی مسائل نہ تھے بلکہ طبیعات کی دنیا تھی۔ مذہبی زندگی کے بارے میں عمومی رویہ عدم دلچسپی، مخالفت اور ایک حقارت کو اختیار کیا گیا۔ مغرب کی تشکیک' الحاد اور لادینیت کے اثرات برصغیر پر بھی مرتب ہونا شروع ہوئے۔ نیاز فتح پوری کی زیر ادارت 1921ء میں ''نگار'' کا اجراء ہوا۔ یہ رسالہ علمی و ادبی مقاصد کے لئے نکالا گیا تھا لیکن بہت جلد اس نے مذہبی تنقید کا

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

آغاز کیا۔ ''نگار'' میں مغرب کے تتبع میں مذہب، خدا، وحی، آخرت، ملائکہ اور روح وغیرہ کے موضوعات پر نام نہاد سائنسی ، عقلی اور لادینی نقطہ نظر سے مباحث چھیڑے گئے۔ اردو زبان اور مسلمان قارئین کے دائرے میں تشکیکی وارتدادی فکر کا یہ پہلا واضح حملہ تھا۔ علاوہ ازیں ''نگار'' نے ایسے مضامین بھی شائع کیے جن میں قرآن پاک کے وحی ہونے میں شبہ کیا گیا' حدیث کی حجیت کو چیلنج کیا گیا' روزے اور نماز کی تعداد پر کلام کیا گیا۔

انقلاب روس (1971ء) کے بعد برصغیر میں اشتراکیت بحث و گفتگو کا موضوع بن گئی تھی۔ پنڈت نہرو نے نیشنلزم کی کھلے بندوں تبلیغ شروع کر دی۔ نوجوان نسل پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ 1925ء میں پہلی آل انڈیا کمیونٹ کانفرنس منعقد ہوئی اور اشتراکی افکار و نظریات کی اشاعت شروع ہوئی۔ ترقی پسندوں نے قدیم معاشرتی اقدار کے علاوہ مذہب واخلاق اور روحانیت و وجدان کو بھی بالخصوص ہدف ملامت بنایا۔

اسلام کے خلاف ایک محاذ مستشرقین کی طرف سے کھلا ہوا تھا تو دوسری طرف بیسویں صدی کے نصف اول میں ہندو دھرم اور تہذیب کے احیاء کی تحریکوں میں جارحیت کا رنگ نمایاں ہوا۔ ایک طرف ہندو اہل قلم نے مسلمانوں کی خون آشامی اور جنگ جوئی کا تذکرہ مبالغہ آمیز پیرائے میں شروع کیا اور دوسری طرف قرآن پاک' سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی شعائر پر تنقید کر کے مناظرہ و مجادلہ کی کیفیت کو تیز تر کیا۔ آریہ سماج اور اشٹریہ سیوک سنگھ کا آغاز بھی ہوا۔ ڈاکٹر مونجے نے 1922ء میں ''سنگھٹن'' کے نام سے ایک تحریک چلائی۔ اس تحریک کا مقصد برصغیر سے مسلمانوں کو ختم کرنا تھا۔ اسی طرح ''شدھی'' کے نام سے ایک ہندو تحریک سوامی شردھانند نے شروع کی۔ اس کی غرض وغایت بھی مسلمانوں کو ہندو بنانا یا ہندوستان سے نکالنا تھا۔ ان تمام حالات و واقعات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے راستے الگ الگ کر دیئے۔

مسلم رہنماؤں نے اخبارات کے ذریعے ہندوؤں کے پروپیگنڈے کا بھرپور اعتماد کے ساتھ جواب دیا ''زمیندار''، ''ہمدرد''، ''الہلال''، ''البلاغ''، ''انقلاب'' اور دیگر اخبارات کے ذریعے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی خیالات کی نمائندگی ہوئی۔ شبلی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان اور محمد علی جوہر وغیرہ ادب، سیاست اور صحافت کے مرد میدان تھے۔ ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' اردو صحافت کا وہ پہلا سنجیدہ اخبار ہے جس میں ''افکار و حوادث'' کے نام سے تنزیہ کالم اور ''فکاہات'' کے عنوان سے تنزیہ شاعری نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اس کے بعد ''زمیندار''، ''ہمدرد'' ''انقلاب'' اور دیگر اختیارات میں فکاہی کالم باقاعدگی سے شائع ہونے لگے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ظفر عالم ظفری نے لکھا ہے کہ:

> ''اس دور میں مسلمان طنز نگاروں نے کسی نہ کسی صورت اسلام سے رہنمائی ضرور حاصل کی اور جس نے اسلامی، سیاسی اور سماجی ضابطوں سے انحراف کیا، اسے طنز نگاروں کے شدید وار سہنے پڑے۔''(۲۷)

ابوالکلام آزاد کی تحریریں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے حوالے سے سامنے آئیں۔ اسلام کے بارے میں ان کی نظر گہری تھی۔ ''الہلال'' ایک علمی' ادبی' سیاسی اور مذہبی رسالہ تھا۔ اس میں زیادہ تر مضامین خود ابوالکلام آزاد لکھتے تھے۔ خطیبانہ رنگ اور

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

اصلاحی جذبہ ان کی تحریروں کی اہم خوبی ہے۔انہوں نے ''افکار و حوادث'' کے عنوان سے فکاہی کالم نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ''الہلال'' کا مقصد دعوت حق کے ساتھ اہل ہند کے سیاسی شعور کو بیدار کرنا اور انگریزوں کے ظالمانہ اور منفی رویوں کو منظر عام پر لانا تھا۔ڈاکٹر ظفر عالم ظفری نے لکھا ہے کہ:

> ''مولانا آزاد کے ''افکار و حوادث''، ''حدیث الغاشیہ'' اور دیگر مضامین دراصل ان کے حساس دل کی گہرائی سے اٹھنے والی ٹیسیں ہیں۔ آزاد کی طنز خالصتاً تعمیری اور اصلاحی ہے۔''(۲۸)

ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خان کی طرح مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور نصراللہ خان عزیز نے بھی اسلامی نقطہ نظر کے حامل کالم لکھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خان کا لب و لہجہ سمندر کے سکوت کی بجائے دریاؤں کا جوش و جذبہ ہے ان کے مقابلے میں عبدالماجد دریا آبادی اور نصراللہ خان عزیز ٹھنڈے دل و دماغ اور جذبات کے مالک ہیں۔ عبدالماجد دریا آبادی لطیف انداز اور دھیمے پن کی وجہ سے معروف ہیں اور ان کے ہاں مبلغانہ انداز بھی نہیں ملتا۔

عبدالماجد دریا آبادی نے 1925ء میں ہفت روزہ ''سچ'' سے فکاہی کالم نگاری کا آغاز کیا۔ ان کے کالم کا نام ''سچی باتیں'' تھا 1943ء تک ''سچ'' نکلتا رہا۔ بعد میں اس کا نام ''صدق'' اور پھر ''صدق جدید'' ہوا۔ مولانا کا کالم ہر اخبار میں شائع ہوتا رہا۔ قیام پاکستان کے بعد روزنامہ ''نوائے وقت'' میں بھی ان کا کالم باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ مولانا کا موضوع اگرچہ اسلامی روایات سے متصادم نظریات وعقائد تھے۔تاہم انکی تحریروں پر اصلاحی جذبہ غالب نہیں وہ اپنی بات منوانے کے لئے نہ تو مبلغ کا روپ دھارتے اور نہ ہی متشدد رویہ اختیار کرتے تھے۔ڈاکٹر ظفر عالم ظفری نے لکھا ہے:

> ''مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ہر اس شخص، جماعت، گروہ، حکومت، مسلمان اور غیر مسلم پر طنز کی جس نے اسلامی اصولوں کو ٹھکرایا۔انہوں نے مسلمان، انگریز اور ہندو تینوں پر طنز کی مگر اس طرح کہ پڑھنے والے ان کی تحریر سے باغی نہ ہوں۔۔۔ان کے طنز کا بنیادی حربہ موازنہ ہے وہ ہر عمل اور قول کا موازنہ اسلامی احکامات سے کرتے۔ اس طرح وہ باطل پر چوٹ بھی کردیتے اور سچ کا اظہار بھی ہو جاتا۔''(۲۹)

مولانا کی طنز اگرچہ مذہبی اقدار کے اختلاف سے جنم لیتی ہے لیکن وہ میانہ روی اختیار کرتے ہیں اور کہیں بھی حد اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے۔

نصراللہ خان عزیز نے بھی ایک طویل عرصے تک خالص اسلامی طنزیہ کالم لکھے۔ان کے کالموں میں موضوعات کی وسعت، طنز میں شدت اور ظرافت کی آمیزش مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ نصراللہ خان عریز کے کالم پکے اور سخت گیر مسلمان کی مانند ہیں جن کو جہاں اور جو بھی غیر اسلامی فعل نظر آیا فوراً پچھاڑ شروع کردی۔ سیاست ہو یا سیاست دان، سماج ہو یا

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

سماجی اقدار، مسلمانوں میں ہو یا غیر مسلموں میں، غرض کہیں بھی وقوع پذیر ہونے والی غیر اسلامی حرکت نصر اللہ خان عزیز کے لئے تازیانے کا کام کرتی تھی۔ڈاکٹر ظفر عالم ظفری لکھتے ہیں:

> ''نصر اللہ خان عزیز نے اپنی ساری زندگی اسلامی اصولوں کی پاس داری میں صرف اور غیر اسلامی اعمال وافعال کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ان کی طنزیات کے سوتے اسلامی اور غیر اسلامی، حق اور باطل، سچ اور جھوٹ، تاریک اور روشن، دین اور کفر کے ٹکرانے سے ہی پھوٹتے ہیں۔''(۳۰)

1940ء میں نصر اللہ خان عزیز جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے۔26جولائی 1948ء میں مولانا نے ''تسنیم'' کا اجراء کیا۔ یہ روزنامہ جماعت اسلامی کا ترجمان تھا۔ نصر اللہ خان عزیز جس اخبار سے بھی رشتہ جوڑتے ''تیر و نشتر'' اور ''سیر و سفر'' کے کالم ساتھ لے جاتے۔ان کا سب سے اہم کالم ''تیر و نشتر'' ہی ہے۔یہ کالم اسلامی سچائیوں کا علم بردار اور حق کا نقیب تھا۔ڈاکٹر ظفر عالم ظفری نے لکھا ہے:

> ''تیر و نشتر'' کا موضع اسلام اور مذاہب عالم تھے۔ہر وہ قول و فعل جو اسلامی تہذیب و ثقافت سے بر سرپیکار ہوتا نصر اللہ خان عزیز کا موضوع بن جاتا۔ انہوں نے اس کالم کے ذریعے غیر اسلامی طرز زندگی پر گہری طنز کی۔اسلام کی آفاقیت اور حقانیت کو واضح کیا۔''(۳۱)

اسلامی اقدار کی پامالی پر نصر اللہ خان عزیز تیر چلاتے اور جسم وروح کی طہارت کے لئے نشتر استعمال کرتے تھے۔ان کا بنیادی حربہ تضاد ہے۔وہ ہر عمل، ہر فعل، ہر تہذیب اور رسم ورواج کا اسلامی تہذیب و ثقافت سے موازنہ کرتے ہیں اور اس موازنہ و تقابل سے طنز خود بخود جنم لیتا ہے۔ سیاسی بے راہ روی ہو یا سماجی، معاشی بے اعتدالی ہو یا کوئی مذہبی ناہمواری وہ ہر جگہ اسلامی روایات کا سہارا لے کر حق اور باطل کو الگ الگ کر دیتے۔

دعوتی ادب کی تحریک سے قبل بھی اردو شعر و ادب میں اسلامی افکار و تصورات پیش ہوتے رہے، مگر یہ کوششیں انفرادی تھیں جن میں اسلام بحیثیت مربوط نظام حیات پیش نہ ہو سکا۔ مثلاً انیس و دبیر کے مرثیوں میں یاد ماضی اور ماتم کنی تو ہے مگر مستقبل کے لیے کوئی لائحہ عمل نہیں۔ اسی طرح کلاسیکی اور جدید اردو شعراء کے ہاں، حتیٰ کہ ہندو شعراء کی تخلیقات پر بھی اسلامی اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہاں اسلام محض عقیدت کی حد تک موجود ہے، بطور نصب العین، دعوت اور تحریک کی حیثیت میں پیش نہیں کیا گیا۔

الغرض: اردو زبان وادب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے ارتقا اور تشکیل میں ہمارے علماء اور صوفیا کا اہم کردار رہا ہے۔اردو کے بالکل ابتدائی دور کے جو نثری نمونے ملتے ہیں وہ سب علماء کے اقوال اور ملفوظات پر مشتمل ہیں، ہمارے بزرگان دین نے اسلام کی تبلیغ کے لیے جس مقامی زبان کا استعمال کیا وہ اردو ہی تھی۔اگرچہ اردو نام بہت بعد میں پڑا، چنانچہ شیخ

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

فرید الدین گنج شکر (م ۱۲۶۵ء) شیخ حمید الدین ناگوری (م ۱۲۷۴ء) خواجہ نظام الدین اولیا (م ۱۳۲۵ء) شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (م ۱۳۸۰ء) وغیر ھم نے اپنی دعوتی مجالس میں اس زبان کا کثرت سے استعمال کیا۔ امیر خسرو کی پہیلیاں تو آج بھی زبان زد عام ہیں۔ اردو ادب خانوادۂ ولی اللٰہی کا مرہون منت ہے، جس کے افراد کی بدولت اردو کے نثری ادب کو فروغ ملا، شاہ عبد القادر، شاہ رفیع الدین نے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا، شاہ ولی اللہ کے پوتے مولانا شاہ اسماعیل شہید کی کتاب "تقویۃ الایمان" کی اشاعت اور اس کی بے پناہ مقبولیت نے نثر نگاری کو ایک نئی جہت دی۔ اس کے بعد تو علماء فارسی کے بجائے اردو میں ہی تصنیف وتالیف کو ترجیح دینے لگے۔ سر سید اور ان کے رفقا خصوصا مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی، مولوی محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور لکھنؤ میں مولانا عبد الحلیم شرر نے نثر نگاری میں ایسی روح پھونکی کہ اردو زبان میں ہر موضوع پر علمی مضامین لکھے جانے لگے۔

بیسویں صدی کی ابتدائی تیسری دہائی تک اردو ادباء اور شعراء کا غالب طبقہ دینی مدارس کی پیداوار تھا اور ادب کی قیادت و سیادت انہی کے ہاتھوں میں تھی، مغربی نظریات کا ہندوستان میں نفوذ بڑھا تو ادب کی کمان شر پسندوں کے ہاتھوں میں چلی گئی، اشتراکیت سے متاثر نوجوانوں نے ہر اس ادب پارے کو دائرۂ ادب سے خارج کرنے کی کوشش کی جس میں مذہب کی آمیزش ہوتی یا اخلاقیات کا دخل ہوتا۔ دین پسند شعراء اور ادباء کو ملّا اور واعظ کا نام دیا گیا، جنسی موضوعات پر لکھے گئے ناولوں اور افسانوں کو اصل ادب قرار دیا جانے لگا، ادب دو حصوں میں بٹ گیا، اباحیت پسندوں کے لیے اخلاق وآداب خار مغیلاں بن گئے لیکن صحت مند لٹریچر کے قارئین کی تعداد بھی کم نہ ہوئی۔ ۱۹۴۷ء تک علماء کی ادبی تحریروں اور تصانیف کو ادب عالی کا شاہکار سمجھا جاتا تھا اور لوگ شبلی، حالی، سر سید، شرر، آزاد، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، اشرف صبوحی اور عبد الماجد کو مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔ قارئین کا ایک حلقہ مولانا آزاد کی کتابوں کا دیوانہ تھا، ہمارے یہ علماء بیک وقت ادیب، شاعر، انشاء پرداز اور عالم دین تھے۔ ماضی قریب میں تعمیری ادب لکھنے والوں میں مولانا اسماعیل گوجرانوالوی، مولانا مودودی، مولانا عامر عثمانی، ماہر القادری، سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، امین احسن اصلاحی اور علی میاں ندوی اور اس طرح کے ہزاروں عالم تھے جو ادب عالی تخلیق کرتے تھے۔ دوسری طرف فکشن کے رائٹرس تھے جو غلاظت پرونے میں لگے ہوئے تھے، ان کا دعوی تھا کہ ہم سماج کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں، اصلاح کا ان کے پاس یہی طریقہ تھا کہ عورت کو سر بازار عریاں کریں۔ اس طرح کی اصلاح قوم کے اخلاقی زوال کی علامت ہے، منٹو عصمت چغتائی، واجدہ تبسم سب اسی قبیل کے تھے۔ منٹو نے دو چار افسانے اچھے ضرور لکھے لیکن جنس کا کیڑا ان کے دماغ میں ہمیشہ رینگتا رہتا۔ عصمت نے اپنے ذاتی تجربے کو لحاف کا نام دے دیا اور ناآسودہ خواتین کو جنسی تسکین حاصل کرنے کا ایک نیا گر بتادیا۔ حالانکہ فکشن میں بھی ایک بڑا طبقہ شروع ہی سے موجود ہے جو ان فواحش کی تطہیر میں مصروف ہے، قدسیہ خانم، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب اور ان کی جماعت کو ہم اسی زمرے میں سمجھتے ہیں۔ ہمارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہمارے سامنے دونوں طرح کی ڈشیں موجود ہیں، یہ ہمارے مزاج اور ذوق پر منحصر ہے کہ ہم کس قسم کی غذا چاہتے ہیں۔

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/iournal.v4i01.288

۱۹۴۷ء کے بعد اردو زبان و ادب میں ایسا زوال آیا کہ وہ نیستی کے کگار پر پہنچ گیا، دینی جامعات زبان کے مربی اور محافظ بن گئے، آج اردو زبان ان جامعات کی بدولت ہی زندہ ہے، لیکن ادب کی سرپرستی اس کی وسعت سے باہر ہے۔ ادب کے چرچے سیمیناروں میں یا یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو میں ہوتے ہیں، وہ بھی سطحی انداز میں۔ عمومی طور پر ادب کا یہ حال ہے کہ ادبی کتابوں کے خریدار تک نہیں ہیں، اگر آپ کو اپنا ادب پارہ قاری تک پہنچانا ہے تو پیسے خرچ کیجیے، چھپوائیے اور کتاب کی دکانوں پر سجا دیجیے، سال بھر میں دس بیس نسخے نکل جائیں گے۔ اسلام نے شعر و ادب کو کبھی شجر ممنوعہ نہیں بتلایا، ہاں کچھ بند شیں ضرور لگائیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی کے مشہور شاعر حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی شاعری کو سراہا، حضرت کعب بن زہیر نے جب اپنا مشہور قصیدہ ''بانت سعاد' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو ایک شعر پر آپ اس قدر خوش ہوئے کہ اپنی چادر انھیں انعام میں دے دی۔ شعر و ادب کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا خاص موقف تھا، وہ اپنے رفقا کو اشعار حفظ کرنے کا مشورہ دیتے تھے، قرآن کریم کا ادبی پہلو اس کا اہم اعجاز ہے، اس اعجاز نے نہ جانے کتنے دلوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ آج بھی ہم عربی شعر و ادب کو پڑھتے پڑھاتے ہیں تاکہ شریعت مطہرہ کے بنیادی مآخذ کو صحیح طور سے سمجھ سکیں۔

دینی جامعات کے طلبا کی زبانیں اگرچہ مختلف ہیں، لیکن اردو تنہا زبان ہے جس کو سارے طلبا سمجھتے اور بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے مدارس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے، ہمارے دین کا سب سے بڑا سرمایہ عربی کے بعد اردو میں ہے۔ جامعات کے طلبا اگر چاہتے ہیں کہ ان کی زبان اور بیان میں اثر ہو، ان کی تحریروں کو لوگ دل چسپی سے پڑھیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ ادبی کتابیں ضرور پڑھیں، زبان شستہ اور سلیس ہو، قوت الفاظ مستحکم ہو، محاورات اور امثال نوک زبان ہوں تو آپ کی تحریر میں ادبی چاشنی اور اثر آفرینی ہو گی لیکن اس کے لیے معیاری ادب کا مطالعہ ضروری ہے۔ قدریں بدل چکی ہیں، زندگی برق رفتار ہو چکی ہے، اگر آپ نے بدلتی ہوئی قدروں کو نہ جانا، ہوا کا رخ نہ پہچانا، اسلوب کی پامال اور فرسودہ ڈگر پر چلتے رہے تو آپ کی آواز کوئی نہیں سنے گا اور آپ کی نگارشات ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جائیں گی۔

حواشی و حوالہ جات

1. سورۃ النحل (۱۶): ۱۲۵۔
2. نجم الاسلام: ''دین و ادب''، ادارہ اردو حیدر آباد، سندھ 1989، ص 104
3. ڈاکٹر تبسم کاشمیری: ''اردو ادب کی تاریخ''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 2003ء، ص 240
4. ڈاکٹر انور سدید: ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص 215
5. نجم الاسلام: ''دین و ادب''، ص 121
6. ڈاکٹر انور سدید: ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد، 1991ء، ص 441
7. ڈاکٹر تبسم کاشمیری: ''اردو ادب کی تاریخ''، ص 642

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/journal.v4i01.288

8. افتخار احمد صدیقی: ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند''(جلد دوم)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور 1971ء، ص185
9. مومن خان مومن: ''مثنوی بہ مضمون جہاد''، مشمولہ: کلیات مومن''، مکتبہ شعر و ادب سمن آباد، لاہور س۔ن، ص418
10. ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: ''اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر''، ص323
11. محمد حسین عسکری: (مقالہ) ''ہمارا ادبی شعور اور مسلمان''، مشمولہ: ''مجموعہ محمد حسن عسکری''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1994ء، ص115
12. شیخ محمد اکرم: ''موج کوثر''، فیروز سنز، لاہور، 1963ء، ص124
13. شمس العلما مولانا شبلی نعمانی: ''مثنوی صبح امید''، رنگین پریس، دہلی، س۔ن، ص ا
14. اکبر الہٰ آبادی: ''کلیات اکبر الہ آبادی، (حصہ دوم، سوم) سنٹرل بک ڈپو، اردو بازار جامع مسجد، دہلی، س۔ن، ص118
15. ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: ''مومن داس کرم چند گاندھی لسان العصر کی نظر میں''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور' 1994ء، ص93
16. علامہ اقبال: ''خضر راہ''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، س۔ن، ص2
17. ڈاکٹر سید عبداللہ: ''اردو ادب۔1857ء تا 1966ء''، مکتبہ خیابان ادب لاہور' 1967ء، ص102-103
18. حفیظ جالندھری: اشعار، مشمولہ: ''عصر حاضر کے نعت گو''، مرتبہ ''گوہر ملسیانی، گوہر ادب پبلی کیشنز، صادق آباد، 1983ء، ص94
19. ڈاکٹر انور سدید: ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص249-248
20. ڈاکٹر انور سدید: ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، ص164
21. ڈاکٹر جمیل جالبی: ''تاریخ ادب اردو ل''(جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور، 1982ء، ص1044
22. ایضاً، ص990
23. مراد اللہ انصاری سنبھلی: ''تفسیر مرادیہ''، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1985ء، ص۔58
24. شاہ اسماعیل شہید: ''تقویتہ الایمان''، مکتبہ خلیل، لاہور، س۔ن، ص46
25. خورشید احمد: (مقالہ) ''دینی ادب''، مشمولہ: ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند''(دسویں جلد)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 1981ء، ص314
26. ڈاکٹر سید عبداللہ: ''اردو ادب۔1857ء تا 1966ء''، ص97

UOCHJRS, ISSN: 2616-6496, Vol. 4 | Issue 1 |June –December 2020
DOI: 10.33195/iournal.v4i01.288

27. ڈاکٹر ظفر عالم ظفری: ''اردو صحافت میں طنزومزاح''، فیروز سنز، لاہور، 1996ء، ص118
28. ایضاً، ص121
29. ایضاً، ص129
30. ایضاً، ص131
31. ایضاً، ص231